الصّوم

(از جناب مولانا سید محمد جعفر صاحب پھلواروی)

یہ پوری کائنات ایک باقاعدہ اور منظم سلطنت ہے۔ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر واقعہ یوں ہی ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم ایک مربوط سلسلہ ہے۔ اس کی مربوطیت اور باقاعدگی خود بتاتی ہے کہ اس پورے نظامِ سلطنت کو ایک ہی فرمانروا بغیر کسی مدد کے چلا رہا ہے اور انسان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اسی مالک الملک کی ایک ادنیٰ رعیت ہے اور اس کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اس احکم الحاکمین کی وفادار و فرمانبردار رعایا بن کر رہے ۔۔۔۔ اسلامی نظامِ زندگی کا بنیادی تصور یہی ہے اور انسانوں سے اس کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے مومن و مسلم (وفادار و فرمانبردار) بن کر رہیں۔

یہ مطالبہ بالکل صحیح اور حق بجانب ہے۔ انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا ہے اور اس لیے یقیناً وہ اپنی اُن قوتوں کا بھی خود خالق نہیں جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پس یہ قوتیں جہاں سے آئی ہیں وہی ان کا خالق اور مالک ہے اور انسان اُن کا فقط امانتدار ہے۔ اور امانتدار کا فرض یہ ہے کہ وہ امانت کو اس کے مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، ورنہ وہ امین نہیں ہوتا خائن قرار پاتا ہے اور جس نوع کی خیانت ہوتی ہے اسی نوع کی سزا بھی دی جاتی ہے، اور جس درجہ کی امانتداری ہو ویسا ہی انعام ملتا ہے۔

اپنی ہر قوت کے استعمال میں انسان ایک ہی وقت میں مجبور بھی ہے اور قادر بھی، مقید بھی ہے آزاد بھی۔

وہ آنکھ سے دیکھنے ہی پر مجبور ہے، کانوں سے بول نہیں سکتا، ناک سے سننے پر قادر نہیں، ہاتھوں میں ذائقہ لانے سے عاجز ہے، زبان سے دید و شنید محال ہے۔ وہ مجبور ہے کہ چار و ناچار اپنی ہر قوت سے وہی کام لے جس کے لیے واضعِ قدرت نے اُسے وضع کیا ہے۔ یعنی لامسہ سے چھوئے، ذائقہ سے چکھے، سامعہ

سے سُننے وغیرہ جیسا۔ غرض اس کی ہر قوت مجبور ہے کہ اسی قانون پر چلے جو انسان سے مشورہ کیے بغیر اور ان قوتوں سے ووٹ لیے بغیر مقنن فطرت نے بنا دیا ہے۔

اسی طرح انسان اس پر بھی مجبور ہے کہ اپنے پھیپھڑے سے کام لیتا رہے اور تارِ نفس کا سلسلہ لامتناہی لگاتار قائم رکھے، معدہ خالی ہو تو کھانا کھائے، حلق خشک ہو تو پانی پیے، ولولۂ شباب سے مغلوب ہو تو وسائلِ نسلیہ کی جستجو کرے ــــ

آپ نے دیکھا انسان سر سے پاؤں تک کتنا مجبور، کیسا بے بس اور کس قدر بے اختیار واقع ہوا ہے؟ ان مجبوریوں میں ایک بھی تو ایسی نہیں جس کا مقابلہ کر کے انسان اپنی ہستی کو باقی رکھ سکے، ایک قانون بھی تو ان قوانینِ تکوین و فطرت میں ایسا نہیں جسے توڑ کر انسان بقاءِ وجود کا لفظ بھی زبان پر لا سکے۔ لیکن اسی انسان کی جامع الاضدادی ملاحظہ ہو۔ ایک طرف تو یہ بے بسی و بے اختیاری اور یہ عاجزی و مجبوری ہے اور دوسری طرف اختیارات کا سمندر اس کے کوزے میں سمویا ہوا ہے۔ قدرتوں کی لامحدود دنیا اس کی مٹھی میں ہے اور اس کی خود مختاری کا طول و عرض ناقابلِ پیمائش ہے۔

بے بسی یہ ہے کہ وہ آنکھوں سے صرف بصارت کا کام لے سکتا ہے اُن سے چکھ نہیں سکتا، سونگھ نہیں سکتا، بول نہیں سکتا، سُن نہیں سکتا۔ کیسی بیکسی اور کس درجہ مجبوری ہے لیکن ساتھ ہی اس کی ہمہ گیری و وسعت کو دیکھو کہ پوری کائنات ذرا سی مردمک (پُتلی) میں سمائی ہوئی ہے۔ اختیارات کی لامحدودیت ملاحظہ ہو، وہ جو کچھ چاہے دیکھ سکتا ہے، جب چاہے دیکھ سکتا ہے، جتنی بار چاہے دیکھ سکتا ہے، جتنی دور چاہے دیکھ سکتا ہے۔ اور آج اس کی قوتِ باصرہ کی اختیاری وسعت کو تم دیکھ رہے ہو کہ کرۂ ماہ کو ۲۴ لاکھ میل سے کھینچ کر صرف ۵ میل پر لے آئی ہے۔ اس چھوٹی سی مردمک میں قدرت و اختیار کی کتنی وسیع دنیا سموئی ہوئی ہے کہ وہ جس شے کو چاہے دیکھے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ ورقِ قرآن کو دیکھے یا اس پر عمل کرے کہ ؎

بر مصحفِ روے او نظر کن　　　خسرو غزل و کتاب تا کے؟

وہ چاہے تو پوری کائنات کو دیدۂ اعتبار سے دیکھے اور چاہے تو اپنا سارا وقت تصاویرِ عریاں کا البم دیکھنے میں صرف کر دے

آزادی و اختیار کو بھی خدا ہی کے قانونِ ہدایت کے مطابق کر دینا آنکھوں کی خدا بندگی و غلامی ہے یعنی آنکھوں سے صرف وہ دیکھا جائے جس کے دیکھنے کا آنکھیں بخشنے والا روادار ہو اور وہاں سے نظر ہٹالی جائے جہاں نظر جمانا اس مالک کی مرضی کے خلاف ہو۔ کانوں سے وہی سنا جائے جس کے سننے کی اجازت مالک نے دی ہو زبان سے وہی چکھا یا بولا جائے جس کے چکھنے یا بولنے کے لیے مولا کے حکم میں کوئی گنجائش موجود ہو غرض اپنی ساری قوتوں کو اس آقائے یکتا کی مرضی کے مطابق بنا لیا جائے حتی کہ دل اور دماغ سے صرف وہی باتیں سوچی جائیں جن کے لیے مالک کا قانون کوئی روک نہ پیدا کرتا ہو۔ اپنے کھانے کو اسی کے حکم کا تابع کر دے، اپنے مشرب کو اسی کے قانون کا مطیع کر دے اور اپنے حیوانی عنصر کی تسکین کو اسی کی ہدایت کے ماتحت رکھے ــــ صوم اسی حقیقت کا بلکہ اس حقیقت کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

صوم کا مقصد صرف "مفطرات ثلٰثہ" (کھانا، پینا اور قربتِ زوج) کے باب میں ہی اطاعت قانون کرانا نہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں قانونِ الٰہی کی اطاعت ــــ اطاعت کی روح ــــ پیدا کرنے کی مشق کرانا ہے۔ مفطراتِ ثلٰثہ تو دراصل شہواتِ نفس یعنی دلی خواہشوں کے تین اہم شعبے ہیں۔ ایسے اہم شعبے کہ ان ہی کی خاطر انسان وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اُسے نہ کرنا چاہیے۔ ان تین پر قابو پانے کے معنی اس مرکزی نقطے اور اُس اصل جامع کو قابو میں لانے کے ہیں جس سے یہ تین اہم شاخیں پھوٹتی ہیں، اور جن کی معاونت میں سرکشی و بغاوت کے تمام شعوب خود بخود شریک ہو جاتے ہیں۔ چور اپنی چوری کو، ڈاکو اپنے ڈاکے کو، رشوت خوار اپنی رشوت کو، خائن اپنی خیانت کو اور ظالم اپنے ظلم کو یقیناً حق نہیں سمجھتے لیکن اپنے اپنے کام سب کیے جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ شکم سے مجبور بلکہ شکم کے غلام ہیں۔ قومِ طالوت نے باوجود نہیِ پیغمبری کے نہرِ مبتلا بہ کا پانی پی لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پیاس نے نافرمانی پر مجبور کر دیا۔ ہاروت و ماروت (اگر روایت کی نوعیت صحیح تسلیم کر لی جائے) چاہِ بابل میں معکوس معلق ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے حیوانی عنصر پر قابو نہ پا سکے۔ اسی جذبہ حیوانی کی تسکین کی خاطر بھائی نے بھائی کو، باپ نے بیٹے کو، عاشق نے رقیب کو اور فرمانرواؤں نے فرمانرواؤں کو تہِ تیغ کیا۔ خوب غور سے دیکھ جاؤ، دنیا میں تمام فسادات کی تہہ میں یہی تین چیزیں کارفرما نظر آئیں گی اور ان تینوں کا مرکز صرف ایک ہے یعنی خواہشِ نفس کی الوہیت و فرمانروائی اور انسان کا اس کی بندگی اختیار کر لینا اَرَأَیْتَ مَنِ

اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰاهُ؟ پس اس جھوٹے الٰہ کو زیر کر لینے کے معنی اس دارالسلطنت پر قابو پا لینے کے ہیں جہاں سے تمام قوائے فساد کا نفاذ ہوتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کسی اخلاقی نظام کی تعمیر صرف قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ صرف قانون سے کچھ دیر کے لیے ممکن ہے کوئی اخلاقی تعمیر ہو جائے، لیکن جلد ہی اس کا نتیجہ فساد ہو گا۔ قانون کی اطاعت وہاں ہو سکتی ہے جہاں مقنن سے کوئی دنیوی امید یا خوف ہو۔ لیکن جہاں ان دونوں کا فقدان ہو وہاں کونسی چیز انسان سے اطاعتِ قانون کرا سکتی ہے؟ اور وہ کونسا فرد یا جماعت ہے جس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت میں اس مقنن کا خوف یا امید ہر لحظہ مسلط ہو؟ دل میں بھی اور ظاہر میں بھی، خلوت میں بھی جلوت میں بھی، نور میں بھی ظلمت میں بھی، آبادی میں بھی ویرانے میں بھی، شہادت میں بھی غیب میں بھی، زندگی میں بھی مرنے پر بھی؟ اور وہ کونسا مقنن ہے جس کے متعلق ایک منٹ کے لیے بھی یہ باور ہو سکے کہ وہ خود بے غرض اور صمد ہے، ہر انسان کا یکساں خیر خواہ ہے، لغزشوں سے پاک اور سبوح و قدوس ہے اور کل اپنی اغراض سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی تبدیلِ کلمات و قانون نہ کر دے گا جس سے ہمارا آج کا فائدہ کل کے نقصان سے بدل جائے؟ پس انسانوں کی سلامتی، عالم کا امن، اخلاق کی تعمیر اور فساد کا فقدان صرف اسی پر موقوف ہے کہ انسان اپنے حقِ قانون سازی سے دستبردار ہو جائے اور یہ حقِ تقنین صرف اس الٰہ واحد کے لیے مخصوص سمجھے جو مذکورہ تمام انسانی کمزوریوں سے مبرا اور پاک ہو۔

اس حقیقت کا یورپ کو بھی عملاً اعتراف ہے۔ بعض یورپی ممالک نے یہ اصول بنایا ہے کہ (A king never errs) بادشاہ لغزشوں سے پاک ہے یعنی سبوح و قدوس ہے۔ اس اصول کی غلطی اتنی ہی واضح ہے جتنی خود اصول بنانے والوں کی بیان ہمہ ان کو اپنے استحکام کے لیے کسی خدا ہی کو جھوٹا سچا واسطہ بنانا پڑتا ہے۔ خود تاجدار برطانیہ کی تخت نشینی کے وقت پوپ یوں اقرار کر لیتا ہے کہ "کہو کہ بادشاہت مسیح کی ہے ہماری نہیں . . . ." مجالس قانون ساز کے ممبروں سے خدا ہی کو واسطہ بنا کر حلفِ وفاداری لیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں خدا اور مذہب ہی کا واسطہ دلا کر بیان لیا جاتا ہے۔ فوجی سپاہی سے بھی بواسطۂ خدا ہی اقرارِ اطاعت کرایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وائسرائے سے ساحل ہند پر قدم رکھنے سے پہلے ہی بائبل ہاتھ میں دے کر وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے۔ یعنی دل میں سب یہی سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی مافوق طاقت کا

واسطہ نہ ہو اس وفاداری کا کوئی یقین نہیں ہو سکتا اور قانون کی اطاعت کسی ایسی ہستی کی مدد کے بغیر نہیں کرائی جا سکتی جو انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تسلیم کی جاتی ہو۔

اگر طولِ بے محل کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ اس صحیح واسطہ کا طریقِ استعمال کتنا غلط رکھا گیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واسطہ فقدانِ واسطہ سے زیادہ مضر ثابت ہوا ہے۔ بہرکیف یہ مسلّم ہے کہ اطاعتِ قانون کے لیے خود مقنن کے ساتھ خوف و امید کا غیر فانی تعلق ضروری ہے۔ لیکن یہ عجیب بے جوڑ اور لایعنی منطق ہے کہ قانون ہو انسان کا اور خوف و رجا ہو اللہ سے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قانون ہو خدا کا اور خوف و رجا کا تعلق ہو انسان سے۔ خدا جس چیز کا مطالبہ اپنے بندوں سے کرتا ہے وہ یہ ہے کہ میرے ہی قانون کی اطاعت کرو اور مجھ ہی سے خوف و امید رکھو۔

قانون خواہ الٰہی ہو یا انسانی، ظاہر میں دونوں ہی قانون ہیں اور دونوں ہی ممکن العصیان ہیں۔ جو بندوں کے قانون کو توڑ سکتا ہے وہ خدا کے قانون سے بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ قانونی بغاوت و نافرمانی سے روکنے والی چیز خود قانون نہیں بلکہ قانون کی وہ روح ہے جو ہر لحظہ انسان کی روح میں ساری و جاری اور اس کے قلب و دماغ پر قابض و مسلّط ہو۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے مجموعۂ خوف و رجا اور مختصر لفظوں میں تقوی اللہ کہتے ہیں۔ قانون خود اپنی اطاعت نہیں کراتا بلکہ تقویٰ کراتا ہے۔ تقویٰ کا سارا تعلق قلب و روح سے ہے اور قانون کی گرفت روح و قلب پر نہیں ہوتی۔ صوم اسی کیفیتِ تقویٰ کو پیدا کرنے کی ایک مشق ہے۔ اور یہ طرفہ تماشا صرف اس خدائی قانون میں ہے کہ یہ نرا قانون ہی نہیں بلکہ روحِ قانون بھی ساتھ ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس میں فقط قانونی صوم کی اطاعت ہی مطلوب نہیں بلکہ مطلق قانون کی روح یعنی تقوی اللہ کی تدریب و مشق اور تمرین و تعلیم بھی ہے۔ اور اسی مقصد کو دو لفظوں میں لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ یہی وہ روح ہے جو بسیط ہو کر انسان کو ہر ہر قدم پر تمام شعبۂ زندگی میں قانونِ الٰہی کا پابند بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ تقویٰ اور یہ روحِ قانون اگر نہ ہو تو سارے قوانینِ الٰہی بھی قابلِ شکست اور ممکن العصیت قوانین بن کر رہ جاتے ہیں، اُن میں اور انسانی قوانین میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا اور صوم ہوتا بھی ہے تو "بریت" سے کوئی ممتاز عبادت نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سارا زور اسی تقوی اللہ پر صرف کیا گیا ہے۔ ہر قانون

کے ساتھ ساتھ تقوی پر زور ہے، تمام قصص میں جگہ جگہ تقوی کی طرف عطف توجہ ہے، سارے اوامر و نواہی تقوی کے ذکر سے پُر ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی الٰہی قانون بھی اپنی اصلی اسپرٹ کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا اور کسی اخلاقی نظام کی تعمیر اس بنیاد کے بغیر ناممکن ہے۔ امریکہ کے قانونِ نشہ بندی کا حشر آپ دیکھ چکے ہیں۔

اب اسی نقطۂ نظر سے صوم کو دیکھو۔ صائم شب کو اٹھتا ہے اور سحری کھانی شروع کرتا ہے۔ ابھی آدھی سحری کھائی تھی کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ختم ہوگیا اور وہ وہیں اپنے لذیذ کھانے کو چھوڑ دیتا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے سامنے شدید بھوک کی حالت میں، اچھے سے اچھا کھانا میسر آتا ہے اور وہ نہیں کھاتا، شدت کی پیاس ہوتی ہے اور ٹھنڈے پانی کا گھڑا یا شربت کا پیالہ سامنے ہوتا ہے اور وہ منہ نہیں لگاتا، مہینوں کے سفر کے بعد گھر واپس آتا ہے اور رفیقہ حیات پہلو میں ہوتی ہے پھر بھی وہ متوجہ نہیں ہوتا ـــ یہ سارے مواقع اسے ایسی حالت میں ملتے ہیں کہ اسے کوئی دیکھنے والا، کوئی بدنامی کا خوف، کسی منفعت کا لالچ اور کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہوتا، لیکن وہ ساری نعمتیں جو اس کے لیے شب کو حلال ہیں، دن کو اپنے اوپر خود اپنی خوشی سے حرام کر لیتا ہے۔ وہ کل تک روزے کو فرض سمجھتا تھا اور آج عید کے دن اسے حرام یقین کر لیتا ہے۔ قانون شکنی سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، ہاں صرف ایک جذبہ، ایک روح اور ایک کیفیتِ خاص ہوتی ہے جو اسے قانونِ الٰہی کی بغاوت سے روک دیتی ہے اور اسی کا نام تقوی اللہ ہے۔ وہ قانونِ صوم کے مقنن سے خوفِ عذاب اور رجاءِ ثواب اس لیے رکھتا ہے کہ وہ اسے حاضر و ناظر جانتا ہے، حی و قیوم سمجھتا ہے، اور اس کی سبوحیت و قدوسیت پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس کا یہ تقوی بالکل غیر شعوری نہ ہو تو ہر جگہ اطاعتِ قانونِ الٰہی میں روح کی طرح کام کرتا ہے۔ اور اگر واقعتاً وہ "صائم سائح" ہے تو اس کے کردار کی بلندی دماغ انسانی کی پرواز سے بھی پرے ہوتی ہے

جب اس نوعیت کا تقوی پیدا ہوتا ہے تب اسی بنیاد پر وہ نظامِ زندگی تعمیر ہوتا ہے جسے انجیلی زبان میں "خدا کی بادشاہت" اور قرآنی اصطلاح میں "دین اللہ" کہتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں سے محض ایک نظامِ سیاست کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اپنے دین کی اقامت چاہتا ہے۔ دین اس ہمہ گیر نظام کو کہتے ہیں جس کا ضابطہ زندگی کے ہر شعبہ پر یکساں حاوی ہو۔ انفراد سے لے کر اجتماع تک ہر نظام اسی کے سانچے میں ڈھلا ہو، اسی کا نظامِ اخلاق، اسی کا نظامِ سیاست، اسی کا نظامِ تمدن،

اسی کا نظامِ معیشت اور اسی کے سارے نظامات ہوں حتیٰ کہ طرزِ فکر اور نظریہ ترک و اختیار اور معیارِ پسند و ناپسند سب کے سب اسی ہمہ گیر قانون کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ یہ دین وہی افراد قائم کر سکتے ہیں جن کے اندر نظامِ اطاعت کی وہ روح موجود ہو جو صوم سے مطلوب ہے۔ اس کے دو جز ہیں جو باہم مل کر ایک نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہے ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل جانا۔ دوسرا ہے ہر غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجانا۔ اب دیکھو روزہ کس طرح ان دونوں مقصدوں پر حاوی ہے۔

انسان یا تو دوسروں کے حکم کا بندہ ہوتا ہے یا اپنی خواہش کا غیر اللہ دونوں ہیں۔ اگر دوسرے حکم چلانے والے وہ ہیں جو صرف اللہ کا حکم چلاتے ہیں جب تو وہ عین اللہ کی اطاعت و بندگی ہے لیکن اگر وہ اپنا حکم یا قانون یا فیصلہ منواتے ہیں تو سرا سر طاغوت ہیں، مثلاً حکومت کافرہ، یا اس سے کم وسعت کے ساتھ برادری۔ ان دونوں کے احکام و قوانین اور فیصلوں سے الگ رہنا نسبتہً سہل ہے۔ ایک حکومت کے حدود میں رہ کر کسی پہاڑ پر زندگی بسر کیجیے یا جنگل میں قیام اختیار کر لیجیے۔ بہت حد تک اور ممکن ہے ساری عمر دونوں کی زد سے آپ بچ جائیں گے۔ آپ کو ان کے قوانین پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی یا آئے گی تو بہت کم آئے گی۔ اور اگر آپ حدودِ مملکت یا حدودِ برادری سے ہی باہر ہو جائیں تو اور بھی آزاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن جس کی غلامی سے آزادی حاصل ہونا سخت دشوار ہے وہ ہے اپنا نفس۔ جہاں اور جس حال میں بھی کوئی ہو گا اس کا نفس اور نفس کی خواہشیں ساتھ ہوں گی اور اپنے حکم کی تعمیل کراتی رہیں گی۔ اس لیے خدا سب سے پہلے جس شے کی بندگی و غلامی و بندگی و اطاعت سے انسان کو نکالنا چاہتا ہے وہ خود انسان کی اپنی خواہشِ نفس ہے۔ اسلامی اسٹیٹ (دین اللہ) انسان پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت بھی نہیں تسلیم کرتا چہ جائے کہ دوسرے انسانوں کی۔

خود انسان کی قائم کردہ حکومت کو دیکھو۔ تم اپنی مرضی سے اگر دشمن ملک میں چندہ بھیجو تو حکومت اس کی روادار نہیں ہو سکتی لیکن حکومت خود جب چاہے تمھارا مال اپنی ضرورت کے لیے بلا تکلف لے سکتی ہے۔ تم اپنی مرضی سے اگر مرنا چاہو ڈوب کر یا جل کر، زہر کھا کر یا کسی طرح خودکشی کر کے، تو حکومت فوراً روک دے گی لیکن جب اُسے خود ضرورت ہو تو جبری بھرتی کا حکم دے سکتی ہے۔ گویا تمھارا مال تمھارا نہیں، تمھاری جان تمھاری نہیں بلکہ یہ سب حکومت کی ملک (STATE PROPERTY) ہے ـــــ بایں ہمہ انسانی حکومتوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہونے پر بھی دیکھ لو کتنا تنگ ہے۔ کوئی خنزیر

کھائے، شراب پیے، زنا کرے، جھوٹ بولے، کلب میں برج کھیلے، ناچ رنگ میں زندگی گذارے، دل میں بغاوت کی تدبیریں سوچتا رہے، اپنے ذہن میں پورے نظامِ حکومت کو سو سو گالیاں دیتا رہے خدائی کا دعویٰ کرے، نبوت کا دعا کرے اور زبان پر ذو معنیین الفاظِ بغاوت لایا کرے، غرض اپنا پرائیویٹ نظامِ زندگی اور بہت حد تک اپنی پبلک زندگی جیسی چاہے بنا تا پھرے، حکومت کا کوئی قانون دخیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن برعکس اس کے اسلامی اسٹیٹ نہ صرف جان و مال کو بلکہ ان تمام اعضاء و جوارح کو بھی جن سے کوئی فعل صادر ہو سکے، ان تمام قوائے ظاہرہ و باطنہ کو جن سے کوئی کام لیا جا سکے، اس زبان کو جس سے کوئی گفتار نکل سکے، اس دل کو جس کے اندر کوئی نیت پیدا ہو سکے اور اس نفس کو جو کوئی خواہش و ارادہ کر سکے، غرض ایک ایک شئے کو اللہ کی اور صرف اللہ کی ملکیت تصور کرتا ہے جو انسان کو محض بطور امانت سپرد کی گئی ہے یہ سب فطرۃً (DIVINE STATE PROPERTY) یعنی خدائی حکومت کی بلا شرکت ملکیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی شے پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ ان کے استعمال اور طریقِ استعمال کا اختیار بھی انسان کو نہیں، حتیٰ کہ جن قوتوں کے استعمال پر وہ فطرۃً مجبور و مجبول ہے ان پر بھی اسے اختیارِ استعمال حاصل نہیں کہ جس قوت سے چاہے، جہاں چاہے، جب اور جس طرح چاہے کام لے۔ اگر انسان اسلامی اسٹیٹ اور مالک الملک کی وفادار رعایا بننا چاہتا ہے تو اسے اپنی ساری زندگی میں ایک ایک قدم پر ہر امانت کے استعمال کے لیے اسی ملکِ الناس کے قانون کا پابند ہو کر رہنا پڑے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، کانوں سے حتیٰ کہ دل و دماغ سے وہی اور اسی طرح کام لے سکتا ہے جو کچھ اور جس طرح ان نعمتوں اور امانتوں کا سپرد کرنے والا الحکم یا اجازت دے۔ وہ اپنی خواہش سے کھا پی بھی نہیں سکتا، اپنی رفیقۂ زندگی سے بھی اپنی مرضی کے مطابق تمتع حاصل کرنے کا مجاز نہیں، اپنی وہ قوتیں بھی اپنی رضا اور خوش دلی کے ساتھ اسی مالک کے سپرد کرنی ہوں گی جن کے استعمال پر ہر آن اس کی فطرت اندر سے ابھارتی رہتی ہے۔

یعنی جب آقا کہے کہ فلاں شئے کھاؤ پیو اور فلاں چیز سے تمتع حاصل کرو تو وہ ان ہی چیزوں پہ قناعت کرلے اور جب وہ حکم دے کہ یہ ساری چیزیں خلاں وقت سے فلاں وقت تک چھوڑ دو تو وہ وہیں وہ اسی طرح تعمیلِ حکم کرے۔ وہ جس شئے کو جب حلال کر دے تو حلال سمجھے اور جب حرام کر دے تو حرام ہی جانے۔ اور اپنے کردار سے واضح کر دے کہ اب ہم خود بھی اپنے مالک

نہیں چہ جائیکہ دوسرے کے مملوک ہوں اور ہم پر اب خود ہماری خواہشوں کی بھی حکومت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی ہو۔ صوم اسی تسلیم و رضا کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

یہ پہلا جزء ہے، یعنی صرف لا الٰہ ہے جس میں ہر غیر اللہ کی حاکمیت و متبوعیت کی نفی ہے۔ اس کا دوسرا جزء الا اللہ ہے۔ اور درحقیقت الا اللہ کے لیے صحیح جگہ ہی اس وقت نکلتی ہے جب لا الٰہ کی تکمیل ہو جائے۔ ورنہ لا الٰہ کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا الا اللہ کے لیے اسی قدر جگہ تنگ ہو گی۔ لا الٰہ سے نفیِ غیر ہو جاتی ہے لیکن مقصود صرف نفیِ غیر اللہ نہیں بلکہ ہر منفی کی جگہ مثبت کو لے آنا مقصود ہے اور وہ مثبت الا اللہ ہے یعنی جب انسان اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم نہ دوسرے کے مملوک ہیں نہ خود اپنی ملک ہیں، نہ ہم دوسروں کے حکم و اختیار کے تابع ہیں نہ اپنے، تو آخر وہ کس کا عبد، کس کا غلام و محکوم اور کس کے حکم و قانون کا تابع فرمان ہے؟ صوم اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ ہم نے فقط اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہر خویش و بیگانہ کے حکم سے نکل آئے ہیں بلکہ ہر طرح کے حکم و حکومت سے نکل کر اللہ کی حکومت و حکم میں آ گئے ہیں اپنی اور ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل کر اللہ کی عبدیت میں داخل ہو گئے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ٹھیک طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک صرف اپنے نفس کی مخالفت کی نیت سے مفطراتِ ثلاثہ سے کامل پرہیز رکھے، یا کسی معالج کے کہنے سے ایسا کرے یا جیل خانے میں اس کا مقاطعہ جوعی (HUNGER STRIKE) بالکل صومی انداز و مقدار کا ہو، یا یہ سب کچھ وہ کسی مجبوری سے محض اپنے ارادے سے کرے لیکن پھر بھی یہ صوم نہ ہوگا۔ فاقہ ہوگا، جوگ ہوگا برت ہوگا، ہنگر اسٹرائک ہو گی، شرارتِ نفس ہو گی، سب ہو گا مگر صوم نہ ہوگا۔ یہ ساری باتیں ایک مسلم اور خدا کا وفادار بھی کر سکتا ہے اور ایک خدا کا باغی کافر بھی کر سکتا ہے۔ ظاہری شکل دونوں کے فاقے کی یکساں ہو گی لیکن دونوں میں خطِ امتیاز کھینچنے والی شئے صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی محکومی و غلامی اور اس کی عبدیت و اطاعت کی نیت و ارادہ ابتغائے مرضات اللہ کا جذبہ یہی ہے وہ روحِ قانون اور تقوی اللہ جو صرف نفیِ غیر اللہ پر قناعت نہیں کرتا، یہ وہاں جا کر دم لیتا ہے جہاں اُسے الا اللہ کی بھی پوری تجلی نظر آ جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان خالص عبد بنتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کچھ کرتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سوچتا ہے

اور اگر وصفِ صائم نہیں بلکہ واقعۃً سائح بھی ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان سے قولِ زُور اور فحش اور غیبت نہیں نکالتا غصہ نہیں کرتا، حتیٰ کہ بے ضرورت گفتگو بھی نہیں کرتا وہی بولتا ہے جس میں اللہ کی رضا ہو۔ اس طرح وہ صرف معدے کا روزہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے سارے اعضا و جوارح صائم سائح بن جاتے ہیں اور اس کا قلب و دماغ بھی روزہ رکھتا ہے۔ "چشم بند و گوش بند و لب ببند" کے معنی "سلطان الاذکار" کے سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی ہو لیکن یہ عبدیت کی اصل نہیں۔ "چشم بندن" کے معنی ان تمام چیزوں سے نظر ہٹا لینے کے ہیں جو اللہ کی رضا کے مطابق نہ ہوں اور یہی مطلب "گوش بندن" اور "لب بندن" کا ہے۔ قابلِ غور ہے حدیثِ قدسی کا یہ مضمون کہ "جب بندہ میری جانب ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف بڑھتا ہوں، وہ خراماں خراماں میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف لپکتا اور دوڑتا ہوا آتا ہوں، یہاں تک کہ میں خود اس کے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ حرکت کرتا ہے اور اس کے وہ کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے ..... فداہ ابی وامی۔ صدق صلی اللہ علیہ وسلم ــــ اس حدیثِ قدسی میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کر جاتا ہے یا "ہمہ اوست" بن جاتا ہے اور بندہ جو جی چاہے کرے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اپنے اندر انابت الی اللہ کا صحیح جذبہ پیدا کر کے اسی کے مطابق سعی و کوشش شروع کرتا ہے تو رحمتِ الٰہی اتنی تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کہ بندہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس عبد کو اتنا قرب و استرضائے الٰہی میں آخرکار ایسی فنائیتِ تامہ ہو جاتی ہے کہ اس کے اعضاء و جوارح کا کوئی حرکت و سکون مرضیٔ مولا کے خلاف نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرتا، بولتا یا سوچتا ہے قانونِ الٰہی کے مطابق اور اسی کی ہدایت و حکم کے موافق۔

ایسے عبد کا نمونہ اگر دیکھنا چاہو تو کسی صائم سائح کو دیکھ لو جو اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیتا ہے کہ ہم صرف اللہ کے عبد ہیں اور فقط اسی کے حکم و قانون کو مانتے ہیں۔ وہ ایک حلال شئے کو ہم پر جب حرام کرتا ہے تو عملاً ہم حرام سمجھ لیتے ہیں اور جب حلال کرتا ہے تو عملی طور پر حلال مان لیتے ہیں ــــ یہی تو وہ عبد ہے جو کسی غیر اللہ کے قانونِ تحلیل و تحریم کو سرے سے نہیں تسلیم کرتا جب وہ بنیادی طور پر اسی عقیدے پر رکھتا ہے کہ اور تو اور ہم خود بھی اپنے اوپر حاکم نہیں تو اس کے لیے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طاغوت اور خدا کے باغی کے کسی قانون کو تسلیم کر کے اس کی حاکمیت و ربوبیت کو مان لے،

خصوصاً قانونِ حلت و حرمت کو؟

ہر سال ہمیں کامل ایک ماہ اس عقیدے کی عملی مشق کرائی جاتی ہے کہ کسی شئے کے لیے حلت و حرمت کا حکم و قانون دینے کا اختیار صرف خدا کا حق ہے اور اس میں کوئی کسی حیثیت سے شریک نہیں، اور ہم شاید یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہر قسم کی قانون سازی کا اختیار بندوں کو بھی حاصل ہے اور یہ حق بندوں کے لیے تسلیم کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں یہی نہیں بلکہ اُس کے حق میں بھی یہ اختیار تسلیم کرنے میں مضائقہ نہیں جانتے جو علانیہ قوانینِ الٰہی توڑ دے اور اپنی وہ مجلسِ آئین ساز بنائے جس کی بنیاد خدا کے بجائے بندوں کی اطاعت و حلفِ وفاداری ہو ایسے طاغیت کا تو وہ قانون بھی قابلِ تسلیم نہیں جو عین مطابق قانونِ الٰہی ہو، جو خود مطیعِ الٰہی نہیں اس کا کوئی حکم، کوئی قانون اور کوئی فیصلہ خدا کے وفاداروں کے لیے قابلِ تسلیم ہی نہیں خواہ وہ بظاہر قانونِ الٰہی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ کسی حکومت میں رہ کر کرنسی نوٹ چھاپیں اور چلائیں تو حکومت پکڑے گی آپ ہزار کہیں کہ صاحب یہ نوٹ بالکل آپ کے نوٹ کے مطابق ہے، وہی کاغذ، وہی تصویر، وہی عبارت، وہی دستخط اور وہی بیل بوٹے ہیں، لیکن آپ پھر اسے بچ نہیں سکتے کیونکہ آپ کا نوٹ اگرچہ عین حکومتی نوٹ کے مطابق ہے لیکن صرف اس لیے آپ پکڑے جائیں گے کہ آپ کو یہ حق و اختیار حکومت نے نہیں دیا ہے اور اس کا چلانا متوازی حکومت (PARELLEL GOVERNMENT) قائم کرنے کا باغیانہ اعلان ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس بادشاہِ کائنات کی خدائی، اس کی سلطنت اور اس کی زمین و آسمان میں رہ کر کسی کو بطور خود قانون بنانے اور اسے چلانے کا مطلقاً کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا کرنا باغیانہ متوازی حکومت قائم کرنے کا مرادف ہے۔ وہ جعلی کرنسی نوٹ کی طرح ٹھیک الٰہی قانون کے مطابق بھی قانون بنانے یا چلانے کا حق نہیں رکھتا۔ ہاں قانون سازی — وہ بھی جزئی — کا حق صرف ایک شکل میں تسلیم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے وہ اللہ کو اپنا واحد بادشاہ تسلیم کرے اور اس کی کسی قائم کردہ حد کو نہ توڑے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت صرف خلیفۃ اللہ یا نائبِ حکومت (VICE GERENT OF ALLAH) کی ہوگی یا ان طابعین و ناشرین کی جو حکومت کی اجازت و حکم سے کرنسی نوٹ طبع کرتے ہیں پس کسی عالم یا درویش کو، کسی مجلسِ آئین ساز کو، کسی برادری کو، کسی ڈکٹیٹر

اور کسی صدر جمہوریہ کو یہ حق نہیں کہ وہ قانونِ الٰہی کو توڑے اور اپنا قانون بنائے اور چلائے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے نزول کے بعد حضرت عدیؓ بن حاتم دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم نے تو کبھی اپنے علماء و مشائخ کو رب نہیں بنایا۔ حضور فرماتے ہیں کہ کیا تم ان کے حلال کردہ کو حلال اور ان کے حرام کردہ کو حرام نہیں سمجھ لیتے تھے؟ عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ۔ حضور فرماتے ہیں کہ بس یہی ہے ربّ بنانا۔

اب ذرا یہ سوچو کہ وہ صائم کتنے مغالطہ میں ہے جو ایک طرف تو روزہ رکھ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ تقنینِ حلال و حرام میں ہم نے اپنا رب اللہ کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن اُسی آن وہ یہ خالص ربانی حق تقنین خدا کے باغیوں کے سپرد بھی کرتا ہے۔ جو حق اللہ نے کسی ولی، کسی امام، کسی صحابی اور کسی پیغمبر تک کو نہیں دیا وہ حق ۔۔۔ صرف تحلیل و تحریم ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے مسائل و مراحل میں ۔۔۔ کسی ڈکٹیٹر، کسی صدر جمہوریہ اور کسی مجلس قانون ساز کے لیے تسلیم کرنے اور اسے جائز مان لینے کے بعد اقرارِ عبدیتِ الٰہی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور ایسے عبد کا صرف صائم ہو جانا فاقہ کشی سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ ایمان تو ہم رکھ سکتے ہیں کہ یہ طاغیت اور یہ باغیانِ خدا نہ ہمارے حاکم ہیں نہ مقنن و حَکَم، نہ قابلِ اطاعت ہیں نہ قابلِ معاونت۔ اگر یہ ایمان بھی نہیں رکھ سکتے تو لیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔

ہم نے صوم کے صرف بنیادی حقائق و مقتضیات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس لیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں، اصل کے ہاتھ آجانے پر فروع خود حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے محل نہ ہوگا اگر باقی اُمور پر بھی محض سرسری نظر ڈال لی جائے تاکہ صائم ہمیشہ اپنے صوم کا جائزہ لے کر دیکھ سکے کہ وہ تقاضائے صوم کو کہاں تک پورا کر رہا ہے۔

(۱) صوم کا سب سے بڑا فائدہ (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) تو یہ ہے کہ انسان اس اکیلے بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت و وفاداری میں آجاتا ہے اور اپنے نفس کا خود محاسب بن جاتا ہے۔ وہ چاہے تو تنہائی میں بغاوت کر لے مگر ایک حاضر و ناظر شہنشاہ کی حکومت اس خلوت میں بھی اس پر مسلط رہتی ہے جہاں اسے کوئی نہیں دیکھتا اور جہاں وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔

(۲) محاسبہ نفس کے علاوہ اس میں ضبطِ نفس بھی پیدا ہو جاتا ہے اور تحمل و صبر بھی۔ جو شخص خور و نوش اور تسکینِ حیوانیت

جیسے کٹھن جذبات کا مردانہ وار مقابلہ کرے وہ دنیا کے تمام شدائد و مصائب کا بآسانی مقابلہ کر سکتا ہے۔

(۳) نعمتوں کی صحیح قدر دانی بھی ایک صائم ہی میں ہو سکتی ہے۔ ترک لذت کے بعد اس کے حصول میں جو لطف ہے اسے وہ کیا جانے جس نے ترکِ لذات کی لذت ہی نہ چکھی ہو۔ اس قدر نعمت کا لازمی نتیجہ جذبہ شکر کا ازدیاد ہے۔

(۴) صحیح انسانی ہمدردی کا جذبہ ایک صائم ہی کے اندر ہو سکتا ہے۔ جس نے کچھ تکلیفیں جھیلی ہوں وہی دوسروں کی تکلیفوں کا بھی احساس کر سکتا ہے۔

(۵) پوری جماعت میں ہمرنگی و مساوات کا عجیب سبق صوم سے حاصل ہوتا ہے۔ بڑے چھوٹے سب ایک اکیلے فرمانروا کی اطاعت میں یکرنگ ہو جاتے ہیں۔ امیر اپنے کو غریبوں جیسا بھوکا اور غریب امیروں کو اپنے جیسا مجبور پاتا ہے اور اس طرح سرمایہ دار و مزدور کی ٹکر کا جذبہ بڑی حد تک فنا ہو جاتا ہے۔

(۶) صیام رمضان کے بعد لاکھوں روپے بشکل فطرہ غریبوں کی جیب میں جاتے ہیں جس سے غربا کی بھی عید ہو جاتی ہے۔ اس معاشی نظام و تقسیم کا سبب دراصل ماہ صیام ہی ہے۔

(۷) تقویٰ بڑے بلند درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو "حلال" کو رضائے الٰہی کے لیے ترک کر دے وہ حرام کو اختیار کر کے اس کی ناراضی کیوں مول لینے لگا؟ گویا صائم کا معیارِ ترک و اختیار بدل جاتا ہے اور اس کا طرزِ فکر الٰہی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ دیگر حقائق صوم، صائم پر خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں اگر وہ روزہ رکھنے کے ساتھ غور و فکر بھی کرے۔ یہ تو وہ فوائد ہیں جو اسی زندگی میں حاصل ہوتے ہیں۔ اخروی منافع کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ حدیث قدسی کے یہ الفاظ عجیب فرحت بخشِ روح ہیں کہ کل حسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف الا الصوم فانه لی وانا اجزی به۔ ہر نیکی کا اجر دس سے لے کر سات سو گنے تک ہے بجز صوم کے کہ وہ تو خاص میرے لیے ہے یا اس کا اجر میرے ذمہ ہے اور اس کا اجر تو بس میں ہی دوں گا۔۔۔ اللہ اللہ اس "لی" کی لطافت اور اس اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کی وسعت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ نماز نہ پڑھو تو پکڑ لیے جاؤ، زکوٰۃ نہ ادا کرو تو داروگیر شروع ہو جائے، حج نہ کرو تو باز پرس کی بوچھار ہو۔ ان میں سے کوئی سا رکن دین ایسا نہیں جو چھپا کر کیا جاتا ہو۔ سب میں اظہار لازما ہوتا ہے اور کسی سے بغیر مواخذے کے

گریز ہی دشوار ہے۔لیکن صرف ایک ہی رکن صوم ایسا ہے جس سے گریز ہر وقت ممکن ہے لیکن خدا کا بندہ یہ خیانت نہیں کرتا۔ وہ جب چاہے تنہائی میں اپنا روزہ توڑ دے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ کیوں؟ کچھ نہ کچھ تو للّٰہیت ہوتی ہو گی۔ اگر یہ عبادت صحیح طور پر ادا ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خالص اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اور یہ "لی" اس خالصیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پھر اس کے اجر کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ بندوں کی پیمائش سے اس کے اجر کا طول و عرض نہیں معلوم کیا جا سکتا، اس لیے خدا نے خود اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ انا اَجۡزِی بہ۔ اس کی جزا تو بس میں ہی دوں گا۔ اس مولا کی کریمی دیکھو چند فاقوں کا کتنا بے حساب اجر دینے پر آمادہ ہے۔ ایک شہنشاہ صلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور صلہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ خود ہی اس کی کوئی تحدید نہیں فرماتا۔ اللہ کے روزہ دار بندو! اپنی قسمت پر ناز کرو، وہ داتا کیا کچھ دینے پر تلا ہوا ہے۔ انا اَجۡزِی بہ کو انا اُجۡزَیٰ بہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی میں خود اس کی جزا بن جاتا ہوں۔ اور اس کا اجر یہ ہے کہ میں خود اسے اجر میں مل جاتا ہوں۔

اس کے خود مل جانے پر کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ "تخلّق باخلاق اللہ" کا صحیح نقش شاید صوم سے بڑھ کر کسی عبادت میں نہیں۔ تخلّق باخلاق اللہ کے معنی ہیں مولا کے رنگ میں رنگ جانا اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا۔ اس کی توحید خالص سورۂ اخلاص میں یوں بیان ہوئی ہے "اللہ بے نیاز ہے، وہ جورو بچے کا محتاج ہے نہ کھانے پینے کا"۔ پس جو اللہ سے تقرب چاہتا ہے وہ اپنے کو کچھ دیر کے لیے سہی اسی رنگ صمدانیت میں رنگ لے اور جس طرح اس کا مولیٰ ان تمام مادی حوائج سے بے پروا ہے اسی طرح وہ بھی ہو جائے۔ پھر قرب الٰہی کا اندازہ کرے اور دیکھے کہ کس طرح اس کا آقا ہی اس کا اجر بن کر مل جاتا ہے۔ جزا میں اس کے ملنے کا مطلب اس کو اپنے قبضے میں لے آنا نہیں بلکہ اس کی رضا کا حاصل ہو جانا ہی عین اسی کا مل جانا ہے۔

لب فرو بند از طعام و از شراب　　　سوئے خوانِ آسمانی کن شتاب

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ (پنجاب)